© rasailojaraid.com

دربارِ نبوت کی حاضری

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، تصنیف وتحریر کا جو ذوق بارگاہِ خداوندی سے آپ کو عطا ہوا ہے، وہ جداگانہ اور منفرد ہے، جس کا مشاہدہ آپ کی تصانیف کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر تحریر ایک سفرنامہ ہے جو آپ نے حج بیت اللہ سے واپسی پر تحریر کیا تھا۔ سفرنامہ کیا ہے؟؟ ...... بقول مولانا سید ابوالحسن ندویؒ: ''حج کے سفرنامے اور مدینہ طیبہ حاضری کی روداد یں تو اردو میں بہت ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک، دل چسپ اور پُر از معلومات، مفید اور سفر کرنے والوں کے لیے ضروری، لیکن یہ البیلا طرزِ بیان اور یہ عاشقانہ ومستانہ داستان آپ کو ہر جگہ نہیں ملے گی، کہ یہ مولانا کا طرزِ خاص ہے اور کم سے کم اس موضوع کے لیے یہ طرز ضروری، مناسب اور مفید ہے کہ شوق انگیز بھی ہے اور ولولہ خیز بھی اور اسی کے ساتھ علم آموز بھی اور خیال افروز بھی'' ...... حضرت کا یہ دل چسپ سفرنامہ قارئین وفاق کے ذوقِ ادب کی تسکین کے لیے پیش ہے۔.......... (ادارہ)

جون ۱۹۲۷ء میں ٹھیک ان ہی دنوں میں جب بہ سلسلہ تعطیل موسم گرما فقیر اپنے وطن گیلانی (بہار) میں تھا، ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوا یا مبتلا کیا گیا جس کے خیال سے بھی دیکھنے والے شاید اب بھی کانپ جاتے ہیں، ایک مولوی اور لوگوں میں نیک نام مولوی، جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر، دکن کا واعظ شہر، ایک پر لطف تماشا تھا کہ بجائے خون کے اس جسم میں ریم اور پیپ کا طوفان اُبلنے لگا۔ باہر سے جلد پر پھنسی کا اثر بھی معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اندر ہی اندر ایسے ایسے بڑے زخم اور پھوڑے پیدا ہو گئے، جن سے آپریشن کے بعد میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن سنا کہ تین تین سیر تک پیپ نکلی، بخار چار پانچ ڈگری تک پہنچ جاتا تھا، اسی سے دماغ عموماً معطل رہتا تھا، حالانکہ دونوں ہاتھ، پاؤں، ران، پشت، الغرض ایک ایک عضو داغدار تھا اور ایسے داغوں سے داغدار تھا، جن کا علم دوسروں کو صرف آپریشن کے بعد ہوا، لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جوان پنہانی زخموں کے انگاروں پر لوٹ رہا تھا، اس کا حال کیا ہوگا؟ مگر "سبقت رحمتي علی غضبي" کی شاید ایک شکل یہ بھی تھی کہ دماغی تعطل نے تکلیف کی شدت کے احساس کو ایک حد تک کند کر رکھا تھا، چالیس دن تک مختلف امراض کے شبہات وشکوک کے تحت اطباء وڈاکٹروں کا تختۂ مشق اپنے گاؤں گیلانی ہی میں بنا رہا، مگر ایک ڈاکٹر جو بحمد اللہ! ابھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندہ ہیں، انہوں نے ابتداء ہی میں مرض کی صحیح تشخیص کرلی تھی کہ نقیح الدم یا پامیا کی بیماری ہے۔ دوسرے اطباء اور ڈاکٹروں کو انہوں نے زبردستی الگ کردیا اور اپنے اختیار تمیزی سے گویا یوں سمجھئے کہ انہوں نے اپنے زیر علاج ہی رکھا، جب یہ اندرونی پھوڑے پک گئے، تب انہوں نے مشورہ دیا کہ دیہات میں اس قسم کے پھوڑوں کا آپریشن ناممکن ہے، پٹنہ کا شہر قریب ترین شہر تھا، جہاں جنرل اسپتال کی آسانی تھی، طے کیا گیا کہ مجھے پٹنہ پہنچایا جائے، مگر ایسے بیمار کو کیسے پہنچایا جائے، جس کے دونوں ہاتھ بھی بے کار، دونوں پاؤں بھی بے کار، حتیٰ کہ پشت پر سونے کا مطلب جس کے لئے یہ تھا کہ زخموں پر پڑا رہے، ایسے بیمار کی منتقلی کا مسئلہ کافی دشوار تھا۔

ایک کھٹولے کو موٹر میں، موٹر سے ریل میں، لوگ جنازے یا تابوت کی طرح منتقل کر رہے تھے، کیول جنکشن پر ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں یہی کھٹولا جب قلیوں کے کندھوں پر منتقل ہو رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرے ہوئے کتے کو پھینکنے کے لئے لوگ جا رہے ہیں۔ بہر حال پٹنہ یہی کھٹولا بیمار کے ساتھ پہنچا۔ اسپتال میں داخل ہوا، دو ڈھائی مہینے کی مدت میں سات آپریشن مختلف اعضاء پر کئے گئے، تماشا یہ تھا کہ آپریشن کر کے مواد ایک عضو سے جب ڈاکٹر خارج کرتے تھے تو دو تین دن کے وقفہ کے بعد کسی دوسرے عضو میں ٹیس اور درد کا زور شروع ہوتا اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا، یہاں تک کہ ساتویں آپریشن کے بعد پاؤں کے ایک حصہ میں پھر درد اور ٹیس کی کیفیت شروع ہوئی، گویا آٹھویں آپریشن کی تمہید شروع ہو چکی تھی کہ پھر کیا ہوا؟ اسے اب کیا بتاؤں؟ بخاری شریف کی روایت جس کا حاصل یہ ہے کہ:

> ''مر گیا ایک حبشی یا حبشیہ، لوگوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے بغیر دفن کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا تو انتقال ہو گیا، یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کیوں اطلاع نہ دی گئی؟ تب لوگوں نے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس (مرنے والے مسلمان) کو ہیچ میرز قرار دیا یعنی فقیر، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی قبر مجھے بتاؤ کہ کہاں ہے؟ قبر کی نشان دہی کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کس مپرس غریب مسلمان کی قبر پر تشریف لائے اور قبر ہی پر اس کی آپؐ نے نماز پڑھی (یعنی جنازے کی نماز پڑھی)۔'' (بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۷۸)

شاید کچھ اسی قسم کے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے کہنے والے نے اس مشہور شعر میں:

دو عالم بہ کاکل گرفتار داریہ ہر مو ہزاراں سیہ کار داری
زسرتا بپا رحمتی یا محمدؐ نظر جانب ہرگنہ گار داری

صبح ہوئی، عجیب صبح تھی، یہ دیکھنے کے لئے کہ پاؤں کا زخم پک کر آپریشن کے قابل ہو چکا؟ ڈاکٹر آئے، آ کر جہاں درد اور ٹیس کی کیفیت تھی، ہاتھ رکھا گیا، جو نشتر کی نوک کو تیز کرتے ہوئے آئے تھے، متحیر ہو کر پوچھ رہے تھے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قصہ کیا ہوا؟ پھوڑا کہاں پر تھا؟ وہ ڈھونڈھتے تھے اور نہیں ملتا تھا، مریض خستۂ جسم وجاں سے پوچھا جارہا تھا اور وہ خاموش تھا، آخر اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ آٹھویں آپریشن کی ضرورت باقی نہ رہی، کیوں باقی نہ رہی؟ یہ ایک راز تھا جس سے نہ اس وقت وہ واقف ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے، سیہ کار پر نظر رحمت پڑ چکی تھی، کالے حقیر سمجھے جانے والے حبشی کی ڈھیر پر کھڑے ہو کر عالمین کی جس رحمت نے دعا کی تھی، مغفرت کی دعا کی تھی، مغفرت کی وہی دعا آج ایک سیاہ کار کے لئے کارگر ثابت ہوئی۔

ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اسی خدائے زندہ وتوانا کی، جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں سے مردوں کو نکالتا ہے کہ ایک سیکنڈ دو سیکنڈ کے لئے بھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لئے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جارہا تھا کہ اب وہ اٹھ رہا ہے، اٹھتا چلا جارہا ہے، جس کی موت کا فیصلہ کیا جاچکا تھا، وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کردیا گیا۔ اسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے، حکم کی تعمیل کی گئی، پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے، شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال، یا ایک جذبے کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا، اس زمانے میں مَیں بہار میں تھا، بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہے ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے، اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا والتماس کے لئے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ابلنے لگے، سن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھتے ہیں، لیکن اردو زبان کے املائی حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے، کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہئے، شاید وہ سمجھے بھی نہیں جاسکتے، لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا، اس لئے ان ہی الفاظ کو نقل کردیتا ہوں:

پیارے محمدؐ جگ کے سجن — تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن — کبھیو کرا ہو تو درشن
جیا کنھڑے، دلوا ترسے — کر پا کے بدرا کہیا برسے
تمری دواریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے — آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے
صلی اللہ علیک نبیا — تمرے دوارے آیا دکھیا ھو راجا
اپنے حُسین و حَسن کا صدقا — ڈھوا گھیریں ناؤ کو اس کے
اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے — سیس پہ اپکے پاداں دھر ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیت کی اگیا من میں بھر ہو — بھدر ہوا پہ تنی کر یا کر ہو
سپنو میں ایسن کر گجر ھو — راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے
رحمت تمرے نام پڑی ہے — اندھرا کے تم رہیا بتا ہو
ہر دے کا اکہے جوت جگا ہو — ڈگری پہ اپنے اکھو چلا ہو
بودھا کے تم بدھی بنا ہو — کھینچو اکھو پاپ نرکھ سے
دھو دیہو کا لیکھ منھ کا اکہے — ان کھر چتوا تمرے سے چلی
کھوجو ابھی ان کا تمرے سے ملی ہے — پی کی پتیا تم ہی لے لہو
ان کھر بتیا تم ہی سنی لہو — ہمنی کے نند یا سے تم جگے لہو
ان تھلیئ تم ہی جلے لہو — دھرمی بھے لوں تم زی دیا سے
مکتی بھی ہوای ہی تمری و دوا سے

"درشن" کی آرزو اس عجیب وغریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولانا سجاد مرحوم اگرچہ بہ ظاہر فقیہ النفس والصورت تھے، مگر ذاتی تجربے کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا، قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلان بھی تشریف لاتے تھے، اسی زمانے میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقعہ ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند:

تمری دوا ریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تم رے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے — آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

"تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں؟" اس استفہامی مصرعہ کو بار بار دہراتے اور بے قرار ہو ہو کر بلبلاتے اور ہے بھی یہ سوال کچھ اسی قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرہ پر تڑپ رہی ہے، زندگی کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے، ایک ڈیوڑھی کے سوا خود ہی سوچئے کہ دنیا میں کون سا آستانہ ایسا باقی رہا ہے جہاں واقعی اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے؟ اس تنہا، واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا، کس کے پاس جائے گا؟ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ، ابراہیم ہوں یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور، اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی، جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی تو اب دنیا کہاں جائے اور اس کے سوا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا فیصلہ کرتے ہوئے ''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں؟'' کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا شہادت والوں کو غیب تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں رہا ہے۔

بہر حال اسپتال سے نکلنے کے بعد ڈاکٹروں کے حسب مشورہ چھوٹا ناگپور کے شہر ہزاری باغ میں کچھ دن گزارے کہ نسبتاً وہاں کا موسم اس زمانے میں ٹھنڈا سمجھا جاتا ہے کہ آب وہوا کی تبدیلی عموماً صحت پرور ہے، ہزاری باغ ہی میں پہلے اٹھنے بیٹھنے اور آخر میں کچھ چلنے پھرنے کی قوت بتدریج واپس ملنے لگی، پھر اپنے دیہاتی مستقر گیلان کی طرف واپس ہوگیا، تقریباً چھ مہینے اس سلسلے میں ختم ہوئے، جامعہ عثمانیہ سے اتنے دنوں تک غائب رہا، تنخواہ بھی نصف ملتی رہی اور ڈاکٹری علاج میں مصارف کا غیر معمولی بار عائد ہوا، غالباً جنوری ۱۹۲۸ء میں پھر جامعہ عثمانیہ میں رجوع ہوگیا اور کام کرنے لگا۔ تقریباً یہ سال بھی پورا ہوا۔ مولانا عبدالباری ندوی (استاذ جامعہ) اور فقیر کچھ دن سے ایک ہی مکان میں رہنے لگے تھے۔ بیماری کے نازک دنوں میں مولانا نے زبانی ہی نہیں بلکہ عملی ہمدردی بھی فرمائی، واپسی کے بعد پھر ان ہی کے ساتھ قیام رہا کیوں کہ تعلقات اس عرصہ میں بہ نسبت پہلے کے اور زیادہ قریب ہو چکے تھے کہ اچانک مولانا نے حج کے ارادے کا اعلان کیا، مولانا نے بھی اعلان کیا اور ان کے بچپن کے رفیق قدیم مولانا عبدالماجد صاحب (مدیر صدق) کی طرف سے بھی اسی اعلان کے اعادے کی خبریں مجھ تک پہنچنے لگیں تھیں اور گو مولانا عبدالماجد صاحب کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع زندگی میں کبھی نہیں ملا، لیکن جن دنوں بیمار ہوا تھا، اس سے کچھ پہلے مولانا سے نیازمندی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا، پٹنہ اسپتال میں جب تقریباً بے ہوش پڑا ہوا تھا اور پہلا آپریشن ہوا تھا، آپریشن کے بعد کچھ خفت محسوس ہوئی، آنکھیں کھل گئیں، تو یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اپنے سرہانے دیکھتا ہوں کہ دعا میں اٹھائے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ کوئی کھڑا ہوا ہے، اتنا ہوش واپس آ چکا تھا، پہچان کر آنکھوں میں آنسو بھر گئے کہ ہمارے کرم فرما مولانا، مولانا عبدالماجد صاحب مدیر صدق ہیں۔ باهم نگر یستم گز شتیم

گویا حیات بعد الموت کے بعد پہلی نظر ان ہی پر پڑی، یہی مقدر ہو چکا تھا، میری علالت کی تشویش ناک خبروں سے بے چین ہو کر مولانا پٹنہ میری عیادت کے لئے تشریف لے آئے تھے۔

الغرض علالت کے اس دوران میں منجملہ دوسری نعمتوں کے ایک اس غیر مترقبہ نعمت سے بھی سرفرازی ہوئی کہ مولانا عبدالماجد اور مولانا عبدالباری ان دونوں بزرگوں کے ساتھ روابط میں غیر معمولی استحکام واستواری پیدا ہوگئی اور امید اسی کی ہے کہ ان بزرگوں کی ذرہ نوازیوں سے دنیا کے ساتھ ''الآخرۃ'' میں بھی استفادہ کا موقع ان شاء اللہ عطا کیا جائے گا کہ ان رواسم وروابط کی بنیاد ''تقویٰ'' پر قائم ہے، ساری خلتیں جس دن عداوتوں سے بدل جائیں گی۔ الا المتقین کو اس عام قانون سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاصہ یہ ہے کہ حیدرآباد کے جس مکان میں خاکسار اور مولانا عبدالباری مقیم تھے، اب اس مکان میں صبح و شام حج اور اس کے مقدمات و تمہیدات کا تذکرہ چھڑا اور اس طرح چھڑا کہ جیسے جیسے سفر کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا، اس تذکرے کے سوا دوسرے تذکروں کی گنجائش کم ہوتی جاتی تھی، سامنے یہ قصہ تھا اور اس عرصہ میں مولانا عبدالماجد صاحب کے مکاتب میں بھی حج ہی کے ارادے اور تیاریوں کا ذکر ہوتا، سمند رناز پر جو مسلسل تازیانے کا کام کر رہا تھا، ہوک دل میں اٹھتی تھی، علالت کے طویل سلسلے نے جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، میری مالی حالت کو زبونی کی آخری حدود تک پہنچا دیا تھا، قرض اور دیون کے بار ہی سے پیٹھ جھکی ہوئی تھی، ایسی صورت میں دبی ہوئی آرزو کے ابھرنے کا موقع کیا تھا؟ مولانا عبدالباری اپنے ملنے جلنے والوں سے جب مسئلہ حج پر گفتگو شروع فرماتے تو ندامت و خجالت کی زردی چہرے پر پھیل جاتی، زبان بھی بند ہوجاتی اور شاید شنوائی کا رشتہ بھی قلب کے ساتھ باقی نہ رہتا، لوگ مختلف مشورے مولانا کو دیتے، یہ کیجئے، وہ کیجئے، حج کے پرانے تجربہ کار سفر کے نشیب و فراز اور ضرورتوں سے آگاہ کرتے اور دور پلنگ پر لیٹا ہوا ایک معذور و مجبور صرف کروٹوں پر کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ نہ کرتا تھا، نہ کچھ کرسکتا تھا۔

دن گزرتے رہے، قصے ہوتے رہے، یہاں تک کہ شاید ہفتہ عشرہ سے زیادہ وقفہ باقی نہ رہا کہ حیدرآباد سے حج کی رخصت کی کارروائی مکمل کرانے کے بعد مولانا عبدالباری اپنے رفیق کو اسی مکان میں چھوڑ کر روانہ ہوجائیں، ولولے اٹھتے تھے اور دب دب جاتے تھے، لیکن وقت کی تنگی اپنے آخری حدود پر پہنچ گئی تھی کہ اچانک عزم کی بجلی سی تھی جو سینے میں چمک اٹھی، شاید رات کی تاریکی میں اس عزم کا مقدس نور قلب میں پیدا کیا گیا، دوسرے دن وہی جو مہینوں سے اس مسئلہ کے متعلق مولانا عبدالباری کے لئے کچھ اجنبی اجنبی سا بنا ہوا تھا، اسی نے مولانا سے عرض کیا کہ ''فرمایئے، اپنی ہمرکابی میں اس کو بھی شریک ہونے کی اجازت مل سکتی ہے، جس کی شرکت کا بہ ظاہر کوئی ذریعہ سر دست پیش نظر نہیں ہے۔'' یہ مولانا کے دل کی بات تھی، چونکہ میری طرف سے کسی رجحان کو نہیں پاتے تھے، وہ خاموش تھے، میرے اس عرض پر شگفتہ ہوگئے، مگر جس تالے کی کنجی گم ہے، اس کے کھلنے کی صورت کیا ہوگی؟

اب کیا بتاؤں کہ جس تالے کی کنجی میری ناقص و جاہل عقل کے نزدیک گم شدہ تھی، وہ میرے سامنے کس رنگ میں ائی گئی؟ تفصیل سن کر کیا کیجئے گا۔ ''بیدہ الخیر'' نے اپنا ہاتھ کھول دیا، نہ کسی سے قرض ہی لینا پڑا، اور نہ امداد و اعانت کی رسوائی و ذلت کی برداشت کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے پر مجبور ہوا، کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی، اسی ہفتہ عشرہ کے تنگ وقت میں ساری کارروائی نیچے سے اوپر تک طے پاگئی اور ٹھیک جس دن مولانا لکھنو اس لئے روانہ ہوئے کہ والدین کو ساتھ لے کر سفر حج پر روانہ ہوجائیں، خاکسار بھی اپنے اعزہ و اقربا سے ملنے اور رخصت ہونے کے لئے حیدرآباد سے راہی بہار ہوا، ماہ رمضان المبارک کی آخری تاریخوں میں گھر پہنچا، عید کی نماز پڑھی اور اہل وطن سے رخصت ہوکر بمبئی کے ارادے سے روانہ ہوگیا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ گیا تک بمبئی میل پر سوار کرنے کے لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ آئے، صرف ایک دری، ایک کمبل، دو چادروں کے علاوہ دو تکیے بستر ے میں رکھے گئے، ان تکیوں سے روئی نکال لی گئی تھی اور یہ ہمارے برادر عزیز مکارم سلمہ کی جدت طرازی تھی کہ روئی کی جگہ ان ہی دو تکیوں میں انہوں نے آٹھ دس جوڑے کرتوں اور پائجاموں کے اور بنیان وغیرہ رکھ دیئے، اب یہی دونوں تکیے میرے تکیے بھی تھے اور یہی کپڑوں کا بقچہ بھی، ٹرنک بھی یہ، سوٹ کیس بھی، یہ تو مختصر سا بستر اتھا، ایک ٹفن کیریر اور چمڑے کا پورٹ منٹو جیسا ایک بیگ، بس یہی کل کائنات سامانِ سفر کی تھی۔

بمبئی میل رات کے تین چار بجے گیا سے روانہ ہوتی ہے، مجھے میرے عزیز بھائی نے ریل کے ڈبے میں بٹھادیا اور ان کے سینے میں جو دبی ہوئی آواز تھی، گریہ اور بکا کی آواز کے ساتھ مل جل کر نکل رہی تھی، وہ کہہ رہے تھے:

''سرکار کے دربار میں جا رہے ہیں، اس غریب دور افتادہ امتی کا سلام عرض کر دیجئے گا اور عرض کر دیجئے گا کہ امت جس حال میں ہے اس کی طرف توجہ فرمائی جائے، ایمان واسلام کی طرف منسوب ہوتے ہوئے بغاوت پر لوگ آمادہ نظر آرہے ہیں، عہد، وفا کا بھلایا جارہا ہے۔''

کچھ یہ اور اسی قسم کی باتیں بے ساختہ رخصت کرتے وقت وہ کہتے جا رہے تھے، میرا دل بھی بھر آیا، گاڑی نے سیٹی دے دی، اپنے عزیز بھائی کے اس آخری پیغام کے سوا اب دماغ اور دل میں کچھ نہ تھا، گاڑی روانہ ہوگئی، دونوں بھائی ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے جدا ہوگئے کہ ''امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جس کی دعا سمیٹ سکتی ہے، وہاں جا کر کچھ پیروی کیجئے گا، گڑگڑائیے گا، روئیے گا۔''

رات کی تاریک فضا کو بمبئی میل کا دیو ہیکل انجن چیرتا، پھاڑتا، چیختا چلاتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اسی طویل گاڑی کے ایک گوشہ میں خدا جانے کن کن آرزوؤں پر لوٹتے ہوئے ایک فقیر بے نوا بمبئی سے قریب ہوتا جا رہا تھا، رات کٹ گئی، دن آیا، وہ بھی گزر گیا، پھر رات آئی اور دوسرے دن کی صبح آٹھ بجے وکٹوریہ ٹرمینس پر گاڑی ٹھہر گئی، پلیٹ فارم پر مولانا عبدالماجد صاحب کی جھلک محسوس ہوئی، وہ پہلے تشریف لا چکے تھے، نوازش فرمائی تھی کہ جو تنہا آرہا ہے، اس کو اپنے ساتھ شہر لے جائیں، مرحوم مولانا شوکت علی کے ساتھ ''خلافت ہاؤس'' میں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، فقیر کو بھی وہیں لے جا کر اس کمرے میں ٹھہرایا، جس میں ہمارے فاضل قدیم دوست مولانا عرفان مرحوم قیام فرماتے تھے، اب اس وقت یاد نہ رہا کہ بمبئی جمعیت العلماء کے رکن خاص تھے اور کسی مسجد میں جس کا نام اب یاد نہ رہا، اسی میں مولانا ریاض النور کا قیام تھا، کبھی کبھی ان سے ملنے چلا جاتا تھا، انہوں نے میرے ساتھ یہ دیکھ کر پان کا عادی ہوں، چند سیر گنگا (بھوپال والا) بنوا کر یہ کہتے ہوئے حوالے کر دیا کہ جہاز میں پان نہ ملے گا، اس وقت یہی گنگا مغتنم ثابت ہوگا، سامانِ سفر میں ٹفن کیریر جو تھا بمبئی ہی میں اسے چھوڑ دیا گیا اور بجائے اس کے ایک کیمپ کارٹ جہاز پر لیٹنے پوٹنے کے لئے اور سمندر کے نظارے کے لئے کپڑے کی ایک آرام دہ کرسی خریدی گئی، آخر وقت جہاز میں سوار ہونے کا آ گیا، سمندر کا یہ پہلا سفر تھا، کیمپ کارٹ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آرام دہ کرسی خوب کام آئی، دس دن جہاز میں گزرے، ملا علی قاری کی "کتاب المناسک" ساتھ تھی، اسی سے مسائل کا التفات کر کر کے ان حاجیوں کو بتادیا جاتا تھا جو پوچھتے تھے، کبھی کبھی رات کی تاریکی میں جہاز کی آخری بالائی سطح پر تنہا چلا جاتا، سامنے سمندر کا پانی اور جگمگاتے تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا سناٹے کے اس عجیب وغریب وقت میں نظارہ، جہاز بڑھتا جارہا تھا، اس خطہ اور پاک سرزمین کی طرف بڑھتا جارہا تھا، دل کی گہرائیوں سے جس کے متعلق رہ رہ کر آواز آتی تھی:

فرخا شہرے کہ تو باشی دراں   اے خنک شہرے کہ تو باشی دراں
وائے امروزم خوشا فردائے من   مسکن یار۔ست شہر شاہ من

(اقبال مرحوم)

برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ کا یاد دلایا ہوا "پیغام" دماغ کی سطح پر پہنچ کر مچلنے لگا، بے ساختہ زبان سے مصرعے نکلنے لگے، ابتداء تو مادری زبان اردو ہی سے شروع ہوئی:

ہر ایک سے ٹکرا کر   ہر شغل سے گھبرا کر
ہر کام سے پچتا کر   ہر فعل سے شرما کر
آمد بدرت بنگر   اے خاتم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

اس کے بعد فارسی کے مصرعوں کا زور بندھا، نیچے اتر آیا، روشنی میں قلمبند کرنے لگا، خاتمہ عربی کے چند مصرعوں پر ہوا۔ "عرضِ احسن" کے نام سے یہی نظم موسوم ہوئی اور پیش کرنے کے لئے "تحفۂ درویش" تیار ہوگیا، مولانا عبدالماجد سے جہاز ہی میں تذکرہ کیا گیا، سنا، کس حال میں سنا، سنانے والے اور سننے والے کے سوا شاید کوئی دوسرا موجود نہ تھا، دل کے حوصلے نکلے، نکالے گئے، دوسرے دن مولانا نے نظم کی نقل مانگ لی، غالباً عدن کے ساحل سے یا جزیرہ قامران (کامران) سے جو ڈاک انہوں نے ہندوستان روانہ کی، اسی میں یہ نظم بھی تھی، دلی سے اس زمانہ میں "ملت" نامی اخبار جعفری صاحب کا نکلتا تھا، پیش ہونے سے پہلے ہی شاید یہ نظم "ملت" میں شائع ہوگئی، بعد کو تو خدا جانے کتنی دفعہ طبع ہوئی، طبع ہونے کے ساتھ غائب ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ اس وقت بجز اس مکتوبہ مسودہ کے مطبوعہ شکل میں اس نظم کی کوئی کاپی خود پیش کرنے والے کے پاس بھی موجود نہیں ہے۔

اسی حال میں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا، پیشانی کی آنکھوں کے لئے مسلسل ایک بسیط نظارہ، وہی نیلا پانی سمندر کا اور نیلے رنگ کا آسمان، اکتادینے والا نظارہ تھا لیکن جہاز جس کا نام غالباً "اکبر" تھا، شاید ہزار سے اوپر آبادی کو لئے ہوئے پانی پر ایک مستقل گاؤں کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا، مولانا عبدالباری اور ان کے والدین، مولانا عبدالماجد اور ان کی اہلیہ محترمہ اخت العرفات کے علاوہ، حضرت مولانا محمد علی (بانی وناظم ندوۃ العلماء، مونگیر) کے تینوں صاحبزادے، مولانا شاہ لطف اللہ مرحوم، مولانا نور اللہ، مولانا منت اللہ ان کی والدہ اور ہمشیرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس خاص تعلق کی وجہ سے جو حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خاکسار رکھتا ہے، یہ مجمع وحدت کی شکل میں جہاز پر سمٹا ہوا تھا، گویا ایک مختصر سا قافلہ اکیس آدمیوں کا بن گیا، اس کا مادی فائدہ یہ ہوا کہ اکیس آدمیوں کے اس قافلے میں بعضوں کے پاس فرسٹ کلاس کے بھی ٹکٹ تھے اور زیادہ درجۂ سوم کے ٹکٹ والے تھے، فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والوں کے طفیل میں تھرڈ کلاس والوں کو عرشہ پر قیام کا بھی موقع ملا اور درجہ اول کے بیت الخلاء غسل خانہ کے استعمال کا بھی حق حاصل ہوا، یہ بھی ہوتا کہ فرسٹ کلاس والوں کے کیبن (کمرے) کے استعمال کی ضرورت اکیس آدمیوں کے اس قافلے میں کسی کو اگر ہو جاتی، تو اس اجتماعی شکل کا فائدہ یہ بھی تھا کہ ضرورت پوری ہو جاتی، یعنی فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والے صاحب عرشہ پر چلے آتے اور اپنی جگہ تھرڈ کلاس والے صاحب کو بھیج دیتے، عرشہ میں کیمپ کارٹ کھٹولے سے خوب مدد ملی۔

اس جہازی بستی کے باشندوں کے لئے ایک ہی مسجد کا انتظام تو ممکن نہ ہو سکا، مگر جماعت کی نماز متفرق جگہوں پر ہوتی رہتی تھی، ایک ٹکڑی کی امامت کا فرض بھی فقیر کے سر تھوپا گیا اور جہاز میں چند موتیں بھی ہوئیں، ان کے جنازے کی نماز بھی اپنے پیشہ ''ملائیت'' کی وجہ سے فقیر ہی نے پڑھائی، اسی سلسلے میں بجائے مٹی کے پانی میں دفن ہونے کا تماشا بھی دکھایا گیا، مرنے والے مرحوم کے پاؤں میں کوئی وزنی چیز (پتھر یا لوہا) ڈال دیا جاتا تھا اور ایک چکنے تختے پر کفن پہنائی ہوئی لاش رکھ دی جاتی جو آسان کے ساتھ سرک کر پانی میں چلی جاتی، جہازی بستی کے اس آبی قبرستان کا نظارہ بڑا دردناک تھا، بحالت مسافرت گھر سے دور اجنبیوں کے درمیان دنیا کے قیام کی مدت پوری کر کر کے لوگ سمندر کی تاریک و عمیق گہرائیوں سے ''عالم نور'' کی طرف روانہ ہو رہے تھے، مرنے والوں کو ان کی آبی قبروں میں سلاتے ہوئے بڑھنے والے آگے بڑھے جاتے تھے۔

☆......☆......☆

حالانکہ ہفتہ دن سے زیادہ مدت نہ گزری تھی، لیکن جانتے ہیں جی جس چیز کو دیکھنے کے لئے سب سے زیادہ بے چین تھا وہ زمین کی مٹی تھی، وہی مٹی جس پر برسوں چلتے پھرتے رہے، اسی سے نکلے، اسی پر زندگی بخشی گئی، اسی پر سوتے اور اسی پر جاگتے تھے، خطرہ بھی اس کا دل پر نہیں گزرا تھا کہ جیسے پیاسا پانی کے لئے ترس جاتا ہے، ایسا وقت بھی اسی زمینی زندگی میں آئے گا کہ ہم مٹی کو دیکھنے کے لئے ترسیں گے، مگر ترسے اور خوب ترسے، یہ ہفتہ مٹی پر نہیں بلکہ پانی پر گزرا، اسی پانی پر جس کے نیچے مٹی تھی مگر میرے لئے تو صرف پانی ہی پانی تھا، عجب پانی! آنکھوں سے جب تک دیکھئے، وہ پانی تھا' مگر ہاتھوں سے چھونے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ شاید گوند ہے، جو پانی میں گھول دیا گیا ہے اور زبان پر رکھنے کے ساتھ ہی نہ پوچھئے کہ ذائقہ کی قوت اس پانی کو کیا پاتی تھی، ''تلخ نمک کا محلول''۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس کڑوے کسیلے، غلیظ گاڑھے پانی کو ہمارے گھروں تک خوش مزہ، شیریں، صاف و پاک، خنک بنا کر کیسے پہنچایا جاتا ہے، سمندر کے اسی تلخ و تند پانی کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر قسم کی آلائشوں اور ناگوار عناصر سے پاک وصاف کر کے انسانی آبادیوں پر لٹنے والا ہر سال کس طرح الٹتا ہے، کیسے الٹتا ہے؟ قدرت کے ہاتھوں کا یہی الٹا ہوا سمندری پانی جو بمبئی میں جہاز کی ٹنکیوں میں بھرا گیا تھا، جب ختم ہو گیا، تو انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے میکانیکی آلات سے سمندر کے اس تلخ وتند پانی کو صاف کیا گیا اور جہازی بستی کے آبادکاروں میں یہی پانی تقسیم ہونے لگا، اس میں شک نہیں کہ ناگوار عناصر سے تو شاید یہ پانی پاک ہو گیا تھا، لیکن ''گوارائی'' کی ایجابی کیفیت سے پھر بھی محروم تھا، پیاس تو اس سے بجھ جاتی تھی، لیکن جی نہیں بھرتا تھا، اس وقت بھی یہی سمجھ میں آیا کہ ''قرآن کسی انسان کا مصنوعی کلام نہیں بلکہ قدرتی کلام ہے۔'' اس دعویٰ کو پیش کرتے ہوئے یہ مطالبہ جو کیا گیا ہے کہ ''اس جیسا کلام لاؤ'' تو قدرتی اور مصنوعی چیزوں میں امتیاز کا اس کے سوا اور معیار ہی کیا ہو سکتا تھا۔

بہر حال مصنوعی ہی سہی لیکن پانی کی پیاس اس مصنوعی صاف کیے ہوئے پانی سے بجھی رہتی تھی، لیکن اس آبی قلمرو میں پہنچ کر مٹی یا خاک دھول کی نئی پیاس کا نیا تجربہ جو پیش آیا تھا، اس کے بجھنے بجھانے کی کوئی صورت غالباً ایک ہفتہ تک سامنے نہ آئی کہ یکایک بعض دوربین نگاہ والوں کی طرف سے ہنگامہ شروع ہوا کہ افریقہ کی سمت میں کچھ دھندلے دھندلے سے دخانی سائے دکھائی دے رہے ہیں، جہاز کی آبی آبادی میں غل مچ گیا، جو تھا اسی دھندلے دھندلے سائے کی جستجو اور تلاش میں منہمک ہو گیا، گویا ساری آبادی جہاز کے ایک ہی حصہ کی طرف پلی اور دھنسی چلی جاتی تھی، تب معلوم ہوا کہ مٹی اور ریت، خاک دھول کی یہ جو نئی پیاس مجھے تڑپا رہی تھی اس پیاس کا تنہا شکار میں ہی نہ تھا، یہ کیا ہے؟ کوئی پہاڑ ہے، کوئی ٹیلا ہے، یا صرف آنکھ کا دھول ہے؟ طرح طرح کے وسوسے تھے، خیالات تھے جو مختلف دماغوں اور دلوں میں پیدا ہوتے تھے، اپنے اپنے احساس کا اظہار ہر ایک کر رہا تھا، سنائی کا شعر:

آب چوں کم شود بجاں جوئند چو بیا بند کون ازو شوئند

اس وقت بجائے پانی کے مٹی پر منطبق ہو رہا تھا، نعمت کی قدر نعمت کے زوال کے بعد ہوتی ہے، آج مٹی اور دھول بھی اس نعمت زائلہ کی شکل اختیار کیے ہوئے تھی، خدا خدا کر کے دھوکے کا بادل پھٹا اور پانی سے دور بہت دور، واقعی ساحل کی کیچڑ کا کچھ حصہ چہرے سے نقاب الٹتے ہوئے بشارت کا پیغام مٹی کے ان پیاسوں کے لئے بننے لگا۔

شور بلند ہوا کہ ''کامران'' کا جزیرہ آ رہا ہے، یہ عرب کے علاقہ یمن سے تعلق رکھنے والا عربی جزیرہ تھا، یہ بھی معلوم ہوا کہ قرنطینہ کے لئے اس جزیرہ میں جہاز والوں کو اتارا جائے گا اوروں کا تو حال معلوم نہیں، لیکن جس خاک سے پیدا ہوئے تھے اس کے فراق کی یہ مدت اپنے لئے ہی ناقابل برداشت بنتی جا رہی تھی، گونہ اطمینان ہوا کہ قرنطینہ ہی کے لئے سہی مگر زمین کے دیکھنے کا موقع تو میسر آئے گا اور اس سے بھی زیادہ تحت الشعور شاید ایک اور جذبہ بھی مخفی تھا، واقعہ یہ ہے کہ زمین کے کرے میں تعدد کا خیال ان ناموں کی وجہ سے جو پیدا ہو گیا ہے جن سے زمین کے مختلف حصوں کو لوگوں نے موسوم کر رکھا ہے، ایشیا، یورپ، امریکہ وافریقہ، یا ہند، چین، ایران ومصر وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ صرف اصطلاحی باتیں ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعے میں خاک کا ایک تودہ ہے جس میں کہیں کہیں پہاڑ، کہیں پانی کے بڑے ذخیرہ پائے جاتے ہیں، لوگوں نے یہ یا اسی قسم کی چیزوں کو حد بنا کر فرض کر لیا ہے کہ فلاں نام والے ملک کی سرحد اس پر ختم ہو جاتی ہے یا فلاں حد سے شروع ہوتی ہے، جغرافیہ کے اٹلسوں میں ان ہی فرضی حدود کے اندر گھرے ہوئے ارضی حصوں کو مختلف رنگوں سے رنگین کر دیا جاتا ہے، واقعہ کی کل نوعیت اتنی ہی ہے لیکن سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے لوگوں نے ان فرضی بلکہ وہمی حدود میں اتنی اہمیت پیدا کر دی ہے کہ دنیا ان ہی وہمی اور فرضی حدود کے احترام و سالمیت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو گئی، محبت و عداوت کے واقعی جذبات کے چند اساسی محوروں میں ایک بڑا اہم محور وہم کی یہی پیداوار ہے اور کچھ ایسا سمجھا دیا گیا ہے کہ جیسے لفظوں میں چین کا لفظ ہند سے اور ہند کا لفظ عرب کے لفظ سے جدا ہے، اسی طرح واقع میں بھی زمین کے یہ علاقے جو ان ناموں سے موسوم ہیں، ایک دوسرے سے جدا اور ایک الگ ہیں، گویا جیسے مریخ کا کرہ زہرہ اور زہرہ کا کرہ مشتری سے تعلق رکھتا ہے، وہی تعلق کرۂ زمین کے ان علاقوں میں بھی ہے۔

بہر حال ہے تو اوطان یا ممالک و اقالیم کا یہ قصہ بالکل وہم کا اختلاق، مگر کیا کیجئے کہ بچپن سے ذہن انسانی میں جو باتیں رچا اور بسا دی جاتی ہیں، عقل لاکھ زور مارے لیکن ان کا دل سے نکلنا مشکل ہے، تجرید و تفرید میں ''نبوت'' اور وہ بھی ''نبوت کسریٰ'' سے بلند منزل پر اور کون ہو سکتا ہے لیکن سیرت کی کتابوں میں اس مشہور واقعہ کا تذکرہ کیا ہی جاتا ہے کہ مکہ سے ایک صاحب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ آئے، آپ نے مکہ کا حال پوچھا، آنے والے صاحب میں غالباً کچھ شعریت بھی تھی، انہوں نے مکہ کی چاندنی راتوں کی بھی چند خصوصیتوں کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ ایسے الفاظ میں کیا کہ راوی کا بیان ہے۔ ''اغرورقت عیناہ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا، چپ رہو۔ (سہیلی) ہر مسلمان خواہ کسی ملک میں رہتا ہو، اس کے کان میں عرب کا ذکر ہوش سنبھالنے سے پہلے گونجنے لگتا ہے، کثرت ذکر غیر معمولی تعلق اس ملک سے پیدا کر دیتا ہے، جس وقت کامران کا ساحل قریب آنے لگا، عرب کے ساتھ تعلق کا بھی غیر معمولی جذبہ متلاطم ہونے لگا، ساحل کے قریب سمندری چیلیں (سی گل) اڑ رہی تھیں، پرندوں پر بھی شاید ایک ہفتہ کے بعد نظر پڑی تھی، ساحل آ گیا، شاید کشتیوں میں بیٹھ کر ہم لوگ جزیرے میں اترے اور ''بسم اللہ الذی بعزتہ و جلالہ تتم الصالحات'' کہتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ سرزمین عرب پر پہلی دفعہ قدم رکھنے کا موقعہ دیا گیا ہے، جی چاہتا تھا کہ بجائے قدم کے سر سے اس پاک زمین کے مس کی سعادت میسر آتی مگر رفقاء سفر کا حجاب مانع ہوا، لوگ قرنطینہ کے قصوں میں تھے اور دیوانہ ادھر سے ادھر چھلانگیں مارتا پھرتا تھا، کیا ٹھکانہ تھا ان ولولوں کا جو اس تصور کے ساتھ دل میں جوش مارتے تھے کہ

''اب میں عرب میں ہوں، عرب ہی کے ایک قطعہ پر گھوم پھر رہا ہوں۔''

(جاری ہے)

© rasailojaraid.com